Cosmos Multidisciplinary Research E-Journal
Online Available at www.cmrj.in
Recognized International Peer Reviewed Journal
Impact Factor 5.3
ISSN No. 2456-1665

اکبرؔ الٰہ آبادی کے تعلیمی نظریات
(تعلیمِ نسواں کے تناظر میں)

Educational views of Akbar Allahabadi
(in the context of women's education)

By
Dr. Farhana Azmi Mohd.Sadique Sheik
Asst. Professor & Head Dept. of Urdu
Mungasaji Maharaj Mahavidyalaya, Darwha, Dist. Yavatmal

مقالہ نگار : ڈاکٹر فرحانہ اعظمی محمد صادق شیخ
اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اُردو
مُنگاساجی مہاراج مہاودیالیہ، دورہا، ضلع ایوت محل

Abstract : The article offers a critical examination of the perspectives of Akbar Allahabadi, a distinguished Urdu poet, regarding women's education. Allahabadi expressed reservations about modern education for women, fearing its potential to undermine traditional values and precipitate moral decline. Nevertheless, he advocated for an education that empowered women to manage households efficiently and support their husbands. Additionally, the article delves into Allahabadi's views on the societal roles of women, emphasizing the importance of preserving veiling, and his portrayal of both Eastern and Western women. Despite the considerable evolution in women's education since Allahabadi's era, the author highlights his enduring message of cultural preservation. This comprehensive analysis offers valuable insights into historical perspectives on women's education and their relevance in present-day society.

Keywords: Akbar Allahabadi, Women's Education, Eastern and Western Cultures, Moral Decay, Traditional Values, Social Role of Women, Preservation of Veiling, Cultural Preservation, Modern Education, Urdu Poetry

تمہید:

حقوق نسواں کے تحت عورتوں کی تعلیم پر گفتگو مسلم دانشور حلقوں میں ہمیشہ سے بحث کا موضوع رہا ہے۔ اسلام مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے تعلیم کی ناگزیر نوعیت پر زور دیتا ہے، جو کہ کسی بھی قسم کے امتیاز سے پاک ہو۔ تاریخی واقعات اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے خواتین کی تعلیم کے لیے ان کی درخواست پر ایک مخصوص دن مقرر کیا تھا۔ خواتین نے اسلامی معاشرے کے مختلف شعبوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، بشمول جنگ اور مسجد میں حاضری، زندگی کے تمام شعبوں میں ان کی متحرک مصروفیت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ تاہم، بدلتے ہوئے سماجی اور سیاسی منظرنامے نے خواتین کی تعلیم کے حوالے سے مسلم مردوں کے خدشات میں اضافہ کیا۔ مختلف خطوں، خاص طور پر افغانستان میں قبائلی رسوم ورواج نے زنا کی روک تھام کے خدشات کا حوالہ دیتے ہوئے، بلوغت کے بعد خواتین کی نقل وحرکت پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ مذہبی بنیادوں کے فقدان کے باوجود، اس طرح کے رواج برقرار ہیں، جو خواتین کی تعلیم کے حوالے سے سماجی رویوں کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ ذہنیت جاگیر دارانہ ہندوستانی معاشرے میں پڑھے لکھے افراد میں بھی برقرار رہی، جو مغربی نظریات کے سامنے آنے اور مختلف ادبی شکلوں کے ذریعے ترقی پسند افکار کے اظہار کے باوجود ان کی فکری ترقی میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دور میں، جدید تعلیم کے آغاز نے مسلم دانشوروں میں روایتی سماجی ڈھانچے کے درہم برہم ہونے کے خدشات کو جنم دیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ جدید تعلیم کے ذریعے لائی گئی روشن خیالی ان کی ثقافتی شناخت کو دھندلا کر دے گی۔ جدید تعلیم کو مغربی اقدار کے مترادف کے طور پر دیکھتے ہوئے، انہوں نے اس کے اثر ورسوخ کو اپنے نوجوانوں میں اخلاقی انحطاط کا باعث سمجھا۔ چنانچہ ان کی جانب سے علمی وادبی کوششوں کے ذریعے مغربی تعلیم کی مذمت کرنے کی ٹھوس

کوششوں کی شروعات ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے کھلے عام جدید تعلیم کی مخالفت نہیں کی تھی، وہ بھی کمزور لہجے میں، خواتین کی تعلیم تک رسائی کو مختلف طریقوں سے محدود کرنے کی وکالت کرتے تھے۔ ان دانشوروں میں سرسید، علامہ اقبالؔ اور اکبرؔ الٰہ آبادی قابل ذکر تھے جنہوں نے انیسویں صدی کے دوران خواتین کی تعلیم کے حوالے سے کھلے عام یا ڈھکے چھپے خدشات کا اظہار کیا۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ بات حیران کن ہو سکتی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خان نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کے لیے مسلم خواتین کی تعلیم کے حوالے سے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ جب کہ انہوں نے مسلمان مردوں کے لیے جدید تعلیم کے فروغ کے لئے تحریک چلائی اور مستقل طور پر جدید تعلیم اور سائنسی سوچ کے فروغ کے لیے اپنی حمایت کا اظہار صرف مسلم مردوں میں ہی محدود رکھا اور زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں اس کی وکالت کی ہے۔

علامہ اقبالؔ اگرچہ عورتوں کی تعلیم کی بھرپور وکالت کیا کرتے تھے، اور بیرونی مضر اثرات سے ان کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے خواتین کو تعلیم دینے کی اہمیت پر زور دیتے تھے۔ لیکن ان کے خیال میں خواتین کے لیے تعلیم کا مثالی طریقہ یہ ہے کہ انھیں اپنے گھروں میں رکھا جائے اور انھیں تعلیم کے بہتر مواقع فراہم کیے جائیں۔ ان کا درج ذیل قطعہ بھی ان کے نقطہ ء نظر کی وضاحت کرتا ہے:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین

بیسویں صدی میں اکبرؔ الٰہ آبادی نے اپنی شاعری میں جدید تعلیم بالخصوص خواتین کی تعلیم کے خلاف ایک نمایاں آواز بلند کی۔ تعلیم نسواں کی تضحیک سے لدی ان کی شاعری نے بڑے پیمانے پر مقبولیت حاصل کی اور عوامی جذبات کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خواتین میں جدید تعلیم کو فروغ دینے کی کوششوں کو مسلم کمیونٹی کی طرف سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، جس کا آغاز جزوی طور پر اکبرؔ الٰہ آبادی کی شاعرانہ مذمت سے ہوا تھا۔ اپنی شاعری کے ذریعے انہوں نے نہ صرف جدید تعلیم پر تنقید کی بلکہ ان مردوں کی بھی مذمت کی جو لڑکیوں کو اسکول اور کالج بھیجنے کی وکالت کرتے تھے۔ وہ ان لوگوں کو بے غیرت اور ذہانت سے عاری قرار دیتے تھے۔

اکبرؔ الٰہ آبادی کا مختصر تعارف:

سید اکبر حسین الٰہ آبادی 16 نومبر 1846 کو ضلع الٰہ آباد کے قصبہ باڑہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد تفضل حسین نے نائب تحصیلدار کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اکبرؔ نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، آٹھ یا نو سال کی عمر میں فارسی اور عربی نصابی کتب کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد ایک مشن اسکول میں داخلہ لیا، حالانکہ مالی مجبوریوں کی وجہ سے پندرہ سال کی عمر میں ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ ملازمت کی تلاش میں مجبور ہو گئے تھے۔ اسی کے ساتھ ہی، چھوٹی عمر میں خدیجہ خاتون نامی گاؤں کی لڑکی سے شادی ہو گئی، جو انھیں قطعی پسند نہیں تھی۔ اس کے بعد انہوں نے الہ آباد میں طوائفوں کے کوٹھوں کا دورہ بھی شروع کر دیا- متعدد خواتین کے ساتھ ان کے رشتے رہے۔ یہاں تک کہ بوٹا جان نامی ایک طوائف سے شادی کی، جس کی بے وقت موت نے اکبرؔ کو گہرا صدمہ دیا۔

اکبرؔ نے ابتدائی طور پر ایک ریلوے ٹھیکیدار کے ساتھ کام کیا، جس سے 20 روپے ماہانہ کی معمولی تنخواہ ملتی تھی، اس سے پہلے کہ ملازمت اچانک ختم ہو جائے۔ اس دوران، انہوں نے اپنی انگریزی کی مہارت کو نکھارا، اور 1867 میں وکالت کا امتحان کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے بعد ہائی کورٹ میں تین سال تک قانون کی مشق کی، جہاں انہوں نے قانونی نظام کے بارے میں قابل قدر بصیرت حاصل کی۔ 1873 میں ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا اور منصف کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ، انھیں ایک شیعہ خاندان کی لڑکی فاطمہ صغریٰ پسند آ گئی، اور اپنی پہلی بیوی سے علاحدگی اختیار کرنے کے بعد بالآخر اس سے شادی کر لی۔ اس کے باوجود وہ اپنی پہلی بیوی کو مالی مدد فراہم کرتے رہے۔ اکبرؔ کو اپنی پہلی شادی سے دو بیٹے تھے۔ 1888 میں، اکبرؔ کو سب آرڈینیٹ جج کے عہدے پر ترقی دی گئی اور بعد میں خفیہ عدالت میں جج کے طور پر کام کیا۔ 1905 میں سیشن جج کی حیثیت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ الٰہ آباد واپس آ گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انکی دوسری بیوی زیادہ دن زندہ نہیں رہیں۔ اکبرؔ اس صدمہ سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ دوسرے بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والا ان کا جواں سال بیٹا، جس سے ان کو بہت محبت تھی، چل بسا۔ ان صدمات نے ان کو پوری طرح توڑ کر رکھ دیا اور وہ مسلسل بیمار رہنے لگے۔ فاطمہ صغریٰ سے اپنے دوسرے بیٹے عشرت حسین کو انھوں نے لندن بھیج کر تعلیم دلائی۔ پہلی بیوی خدیجہ خاتون 1920ء تک زندہ رہیں۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے 1907 میں انھیں "خان بہادر" کے خطاب سے نوازا اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا فیلو مقرر کیا گیا۔ ان کا انتقال 9 ستمبر 1921 کو ہوا۔

اکبرؔ الٰہ آبادی، ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور زبان کی جڑوں سے جڑے ہوئے ایک قابل ذکر شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہندستان کی سماجی، ثقافتی، اور سیاسی منظر نامے کے جوہر کو اجاگر کیا۔ ان کی شاعری انگریزوں کے اس دور کی عکاسی کرتی ہے جب ادب، تہذیب، ثقافت اور سماج پر مغربی تہذیب کے گہرے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ اکبرؔ کا شاعرانہ انداز روایتی فکر سے معمور انقلابی طرز کا کلام تھا، جو جدیدیت سے بغاوت اور اصلاح کی فکر سے آراستہ تھا۔ ان کی شاعری وسیع ذخیرہ الفاظ اور لسانی مہارت سے مالامال نظر آتی ہے۔ مغربی نظریات کے مروجہ اثر و رسوخ کے باوجود، اکبرؔ الٰہ آبادی برطانوی نو آبادیاتی حکمرانی اور سیاسی قیادت سے لاتعلق، اپنے عقائد و نظریات پر ثابت قدم رہے۔ اگرچہ وہ ایک برطانوی ملازم تھے مگر انگریزوں کی اندھی تقلید کے سخت مخالف تھے۔

اُردو ادب کے قاری جب اکبرؔ الٰہ آبادی کے ظرافت سے بھرپور اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہنستے ہیں، مسکراتے ہیں اور جب اس شاعری کو سامنے رکھ کر اپنا محاسبہ کرتے ہیں تو شرمندہ بھی ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری سے اصلاح معاشرہ کا وہ کام لیا جو سر سید احمد خان اور علامہ اقبال جیسی شخصیتوں کا شیوہ رہا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اکثر سماجی برائیوں، مغربی تہذیب اور لادینیت کو طنز و مزاح کے پیکر میں ڈال کر تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کی اس طرز شاعری کی خوبی ہی تھی کہ لوگوں کی انا کو ٹھیس بھی نہیں پہنچتی تھی اور وہ اپنا محاسبہ کرنے پر مجبور بھی ہو جاتے تھے۔

اکبرؔ نے اپنی شاعری کا آغاز سنجیدہ شاعری سے کیا پھر طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب اختیار کیا اور اس میں اپنا وہ مقام بنالیا کہ ان کی سنجیدہ شاعری کو وہ اہمیت نہیں دی گئی اور وہ طنزیہ اور مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ اکبرؔ نے اپنی شاعری میں معاشرے کے ان رویوں، ان خیالات پر طنزیہ و مزاحیہ انداز میں اظہار خیال کیا جن میں توازن نہیں تھا انہوں نے اس پر زور دیا کہ ہمیں اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور قدروں کی بنیاد پر ترقی کرنی چاہیے۔ اکبرؔ کی شاعری کو رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں خراج تحسین پیش کیا اور کلیم الدین احمد نے اکبرؔ کی شاعری کو صحیح تناظر میں دیکھا۔ اب تک جس نہج پر اکبرؔ کی شاعری پر تنقید کی جارہی ہے اس میں خوش گوار تبدیلی آئی ہے۔ اکبرؔ نے طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھایا اور اردو شاعری میں اپنے اسلوب، موضوعات اور زبان سے گرانقدر اضافہ کیا۔

اکبرؔ کی شاعری کو صرف مزاحیہ قرار دینا نہ صرف ان کے لیے بلکہ مجموعی طور پر اردو شاعری کے لیے بھی خسارہ کا سبب ہو گا۔ اپنی غزلوں، نظموں اور قطعات کے ذریعے اکبرؔ نے زبان اور اظہار پر بے مثال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جدید دور میں اپنے ہم عصروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ روایتی غزل کی صنف میں انقلابی تجربہ کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تنوع اور فنکاری کا امتزاج اقبالؔ کی شاعری کا مقابلہ کرتا ہے، جو انہیں اردو ادب میں ایک علمبردار قرار دیتا ہے۔ اکبرؔ کو پہلا شاعر قرار دیا جاتا ہے جس نے عام زبان کے عناصر جیسے اونٹ، گائے، شیخ، مرزا اور انجن کو علامتی طور پر استعمال کیا، جس نے اردو میں علامتی شاعری کی بنیاد رکھی۔ ادبی فہم رکھنے والوں کے لیے، اس کے الفاظ گہری سوچ، عقل، لسانی صلاحیت اور بامعنی بصیرت سے پر خزانہ ہے، جو تلخ سیاسی حقائق کی دلکش عکاسی کرتے ہیں اور سیاست دانوں کی اصلیت کو بے نقاب کرتے ہیں۔

اکبرؔ کی شاعری کی متفرق خصوصیات:

اکبرؔ کو اردو شاعری میں طنز و ظرافت کے استاد کے طور پر سراہا جاتا ہے۔ ان سے پہلے اردو شاعری میں طنز و مزاح، ریختی یا ہجویات کے سوا، کوئی اہمیت اور تسلسل نہیں حاصل کر سکا۔ تاہم اکبرؔ نے مزاح کی ایک نئی جہت متعارف کروائی جس کا مقصد محض تفریح سے بالاتر تھا۔ انہوں نے تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا اور ابھرتے ہوئے سماجی طبقے کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا، جو ہندوستانی روایات کی قیمت پر مغربی اقدار کی طرف بڑھتے ہوئے جھکاؤ کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں، انہوں نے اپنی شاعری قوم و ملّت کی بیداری اور فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دی۔ ایسا نادر اسلوب اپنایا جس میں بغیر کسی رکاوٹ کے طنزیہ انداز میں نصیحت اور تنقید کے ساتھ اپنے اصلاحی پیغام کی ترسیل کو یقینی بنایا۔ اکبرؔ کے کلام میں ایک مقناطیسی خوبی ہے، جو سوز آتش سے بھری ہوئی ہے جو اس کی خوبصورتی کو ایک نشہ آور رغبت سے دوچار کرتی ہے، اور لفظ لفظ سے صداقت کا احساس دلاتی ہے۔ ان کے طنز میں مزاحیہ انداز میں بظاہر دوسروں کی کوتاہیوں کی جانب طرف اشارہ کیا جاتا ہے، لیکن ہنسی کے تھمنے کے بعد خود شناسی اور نصیحت کا باعث بھی بنتا ہے۔ اکبرؔ کی طنزیہ شاعری سامعین کو اس احساس کی طرف لے جاتی ہے کہ ان کے طنز کا مقصد انفرادی اصلاح کے بجائے اجتماعی طور پر معاشرتی اصولوں کی بقاء کے استحکام کو فروغ دیتی ہے۔ ان کے اندازِ فکر نے مستقبل کے شاعروں کے لیے اظہار کی نئی راہیں ہموار کی ہیں۔ ان کی شاعری کی اہمیت محض ادبی خوبیوں سے بالاتر، گہرے معاشرتی تبصروں اور ثقافتی روایت کی عکاسی کو خود میں سمیٹے ہوئے ہے۔

اکبرؔ کی شاعری میں تعلیم نسواں:

اکبرؔ الٰہ آبادی کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں ایک ایسی شخصیت کا سامنا ہوتا ہے جو ذہنی اور فکری سطح پر انگریزی تہذیب و تمدن کی سخت مخالف نظر آتی ہے۔ اکبرؔ کی نفرت انگریزی ثقافت سے بڑھ کر ان کی زبان، تعلیم اور اس سے وابستہ حکومت کے لئے خاص تھی۔ یہ مخالفت ممکنہ طور پر ان کی اپنی ثقافت سے گہرے تعلق

کے سبب پیدا ہوئی ہے۔ ان کا پیغام جدید تہذیب کے ہنگاموں سے بچنے اور اپنے روایتی ورثے کی اقدار سے دوبارہ جڑنے کے مطالبے سے آراستہ نظر آتا ہے۔ ابتدائی طور پر اکبرؔ نے روایتی انداز میں غزلیں لکھیں، لیکن انہوں نے جلد ہی اصلاح پر مبنی شاعری کے لیے اپنی صلاحیتوں اور حدود کو پہچان لیا۔ اقبالؔ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انہوں نے نظم کی ایک نئی شکل اختیار کی، جس سے اردو شاعری کو نئی جہتیں ملی۔ تاہم، کچھ اسکالرز کا استدلال ہے کہ سر سید کے خلاف ان کی مخالفت محض اصلاح سے آگے بڑھ کر آزادی اور ترقی کے لیے ایک وسیع مزاحمت بھی شامل تھی- تعلیم معاشروں اور افراد دونوں کی مناسب ترقی کے لیے بنیاد کا کام کرتی ہے۔ یہ انسانی زندگی میں تنظیم اور تحریک کو آسان بناتی ہے اورانسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے افراد اپنی صلاحیتوں اور قابلیت کو نکھارتے ہیں۔ یہ تسلیم کرنا بہت ضروری ہے کہ تعلیم صرف مردوں کے لیے خاص نہیں ہے۔ یہ خواتین کے لیے بھی یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ تاہم، خواتین کی تعلیم کے بارے میں اکبرؔ الٰہ آبادی کا نقطہ نظر اس تصور سے ہٹ جاتا ہے، جس کا عکس ان کی شاعری میں صاف صاف جھلکتا ہے۔ وہ خواتین کی جدید تعلیم کی اہمیت کو مسترد کرتے ہوئے اس پر شکوک کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق، خواتین کے لیے انگریزی تعلیم فحاشی اور روایتی اقدار کی بے توقیری کا باعث بن سکتی ہے، جو ممکنہ طور پر انہیں آزاد طرز زندگی کے لیے اپنے گھروں کو ترک کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ یہ جذبہ ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے، جس میں وہ خواتین کی جدید تعلیم کے حصول کو نشانہ تنقید بناتے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کی نظر میں جدید تعلیم معاشرتی اصولوں اور خاندانی اقدار کو زائل کرنے کا سبب ہو سکتی ہے۔ خود فرماتے ہیں:

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن ، پہلے چراغ خانہ تھی

اکبرؔ الٰہ آبادی نے اپنی شاعری سے ان خدشات کو جنم دیا کہ اگر خواتین انگریزی سیکھیں اور اس زبان میں مہارت حاصل کریں تو اس سے ہماری تہذیب کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ انھیں خدشہ تھا کہ شرم و حیا جیسی خوبیاں جو مشرقی خواتین کا خاصہ ہے، مغربی تہذیب کی بے شرمی کے سبب ختم نہ ہو جائے۔ انہوں نے اس خوف کے سبب، خواتین کو اپنے گھروں کی حدود سے باہر نکلنے اور بیرونی دنیا میں ان کی نمائش کو محدود کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ پڑھی لکھی خواتین کے سڑکوں پر گزرنے کے محض خیال نے انھیں خوف سے بھر دیا، ان کی آنکھوں کے سامنے ایک پریشان کن منظر نامے کا تصور ابھر آیا۔ فرماتے ہیں:

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں
دل کش و آزاد و خوشرو ، ساختہ پرداختہ
یہ تو کیا معلوم کیا موقعے عمل کے ہوں گے پیش
ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بے ساختہ
ان سے بی بی فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، اکبرؔ انگریزی تعلیم کو بے حیائی اور بے ادبی کی علامت سمجھتے تھے۔ خواتین کی تعلیم کو روشن خیالی یا معاشرتی ترقی سے جوڑنے سے گریز کرتے ہوئے انہوں نے مزاحیہ انداز میں اس نقطۂ نظر کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کے نقطۂ نظر میں، خواتین کی انگریزی سیکھنے کا امکان معاشرے کے اندر بے شرمی اور بے حیائی کے پھیلاؤ سے جڑا ہوا تھا۔ اپنے اس خوف کو انھوں نے کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے، اشعار ملاحظہ فرمائیں:

میں بھی گریجویٹ ہوں، تو بھی گریجویٹ
علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آ کے لیٹ

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

دونوں نے پاس کر لیے ہیں سخت امتحاں
ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بدگماں
بولی یہ سچ ہے علم بڑھا، جہل گھٹ گیا
لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان ہٹ گیا
اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو سنوارا

اک پیر نے تہذیب سے لڑکی کو سنوارا
پتلون میں وہ تن گیا، یہ سائے میں پھیلی
پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اُتارا

لیکن اس کا قطعی مطلب یہ نہیں ہے کہ اکبرؔ سرے سے عورتوں کی تعلیم کے مخالف تھے۔اس کے برعکس، انہوں نے اس کی وکالت کی۔ ان کا خیال تھا کہ خواتین کو مختلف پہلوؤں پر مشتمل تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ اس میں مذہبی علم، حفظان صحت کے اصول، حساب کتاب کی بنیادی مہارتوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور تعلیمی لٹریچر بھی شامل تھا۔ ان کا موقف خواتین کو گھریلو انتظام، بچوں کی پرورش، اور اپنے شوہروں کی مدد کرنے کے لیے ضروری تعلیم سے آراستہ کرنے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ ان کی تمام تر مخالفت انگریزی تعلیم، تہذیب و تمدّن سے وابستہ نظر آتی ہے۔

اکبرؔ نے اس تصور کو قبول کیا کہ عورت کی زندگی مرد کی خدمت کرنے اور اس کے ماتحت ہونے کے گرد گھومتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ عورت کے اثر و رسوخ کا دائرہ گھریلو معاملات تک ہی محدود ہونا چاہیے۔ جہاں ان کے فرائض بنیادی طور پر بچوں کو جنم دینا، ان کی پرورش اور اپنے شوہر کی ضروریات کو پورا کرنا شامل ہیں۔ مزید بر آں، اکبرؔ نے عورتوں کے لئے خاندان کی عزت اور ساکھ کو برقرار رکھنے کی اہمیت پر زور دیا، اور یہ تجویز پیش کی کہ عورت کے طرز عمل کو اس کے شوہر اور گھر والوں پر مثبت انداز میں ظاہر کرنا چاہیے۔ اکبرؔ کے مطابق زندگی میں عورت کے کردار کو بنیادی طور پر مرد کی خدمت اور اس کے تابع ہونے کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ اکبرؔ کے مطابق، عورت کا وجود گھر کی چار دیواری میں زیادہ بہتر ہے، جہاں اس کی بنیادی ذمہ داریوں میں بچے کی پیدائش، بچے کی پرورش اور شوہر کی فرمانبرداری شامل ہے۔

دو شوہر و اطفال کی خاطر اسے تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ اکبرؔ سرے سے تعلیم نسواں کے مخالف تھے اور لڑکیوں کو بالکل ہی ناخواندہ رکھنے کے حامی تھے۔ وہ تعلیم نسواں کے حامی تو تھے، لیکن وہ اس تعلیم کی تائید کرتے تھے، جو رابعہ بصری نہ سہی دورِ مغلیہ کی جہاں آراء بیگم ہی کے نمونے پیدا کرے، نہ کہ اس تعلیم کی، جو زینت ہو پکچر پیلس اور نمائش گاہوں کی۔ وہ اس تعلیم کو رحمت نہیں، خدا کا قہر سمجھتے تھے، جس کے حصول کے بعد لڑکیوں میں ہالی ووڈ اور بالی ووڈ کی طلب پیدا ہو۔ وہ اس نظامِ تعلیم کے سخت مخالف تھے، جو مہربان مائیں، وفا سرشت بیویاں اور اطاعت شعار لڑکیاں پیدا نہ کرے اور ملّت کی لڑکیوں کو تھیٹر میں ایکٹری اور برہنہ رقاصی کے کمالات کی طرف لے جائے۔ وہ ملک میں حوریں پیدا کرنا چاہتے تھے، کہ دنیا جنت نظیر بن جائے۔ وہ پریوں کے مشتاق نہ تھے، کہ ملک "راجہ اندر" کا اکھاڑا ہو کر رہ جائے، ان کا قول تھا کہ:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے، مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
ذی علم و متقی ہوں، جو ہوں ان کے منتظم
استاذ ایسے ہوں، مگر "استاد جی" نہ ہوں

"استاذ اور استاد جی" کے لفظی فرق کو جس خوبی کے ساتھ برتا گیا ہے، وہ بس انہی کا حصہ ہے، استاذ تو ادب اور اخلاق کی تعلیم دینے والے کو کہتے ہیں، جبکہ استاد جی اربابِ نشاط کو تعلیم دینے والے کو کہتے ہیں۔ ایک اور طویل نظم میں لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے اپنا پورا مسلک وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، چند اشعار پیش ہیں:

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہے، وہ بے شعور ہے
ایسی معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت

ہو وہ طریق، جس میں ہو نیکی و مصلحت
ہر چند ہو وہ علم ضروری کی عالمہ
شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ

عصیاں سے محترز ہو، خدا سے ڈرا کرے

اور حسنِ عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے

آگے حساب کتاب، نوشت وخواند، اصولِ حفظانِ صحت، کھانا پکانے اور کپڑے سینے وغیرہ کو درسِ نسوانی کا لازمی نصاب بتا کر فرماتے ہیں:

داتا نے دَھن دیا ہے، تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر کی دیوی بنی رہو
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے
دنیا میں لذتیں ہیں، نمائش ہے، شان ہے
ان کی طلب میں، حرص میں سارا جہان ہے
اکبرؔ سے یہ سنو! کہ یہ اس کا بیان ہے
دنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے
حد سے جو بڑھ گیا، تو ہے اس کا عمل خراب
آج اس کا خوش نما ہے، مگر ہو گا کل خراب

مغربی نظامِ تعلیم بھی حضرت اکبرؔ کا خاص موضوع تھا اور اس کی طرف خواتین کے روز افزوں بڑھتے ہوئے رجحانات سے بھی وہ بہت ملول اور کبیدہ خاطر تھے؛ چنانچہ ایک جگہ مغرب کی طرف سے اٹھنے والی تعلیمِ نسواں کی تحریک اور بے پردگی کو لازم وملزوم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

مجلسِ نسواں میں دیکھو عزتِ تعلیم کو
پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

مشرق میں بہترین عورت کا تخیل یہ ہے کہ وہ شروع سے نیک سیرت، بااخلاق اور ہنس مکھ رہے، وہ جب بات کرے تو اس کے منھ سے پھول جھڑے، وہ دینی تعلیم حاصل کرے اور خانہ داری کے طور طریقے سیکھے، کہ آگے چل کر اس کو گھر کی ملکہ بننا ہے، بچپن میں والدین کی اطاعت اور شادی کے بعد شوہر کی رضامندی کو پروانۂ جنت خیال کرے؛ تاکہ خانگی شیرازہ اس کی ذات سے بندھا رہے، خاندان کی مسرتیں اس کے دم سے قائم رہیں اور وہ صحیح معنی میں "گھر کی ملکہ" ثابت ہو۔ اس کے برخلاف فرنگیوں کے یہاں عزت کا معیار بدلا ہوا ہے، وہ عورت ہی کیا؟ جس کے حسن گفتار، حسن رفتار، حسن صورت، زیب وزینت، خوش لباسی، گلوکاری اور رقاصی کے چرچے سوسائٹی میں عام نہ ہوں، اخبارات میں اس کے فوٹو شائع ہوں، زبانوں پر جب اس کا نام آئے، تو کان ودہن لذت اندوز ہوں۔ اس کا جلوہ آنکھوں میں چمک پیدا کر دے، اور اس کا تصور دلوں میں بے انتہا شوق۔ بہترین عورت وہ نہیں، جو بہترین بیوی اور بہترین ماں ہو؛ بلکہ وہ ہے، جس کی ذات دوست واحباب کی خوش وقتیوں کا دلچسپ ترین ذریعہ ہو اور ایسی ہو کہ اس کی رعنائی ودل ربائی کے نقش ثبت ہوں۔ حسن وناز کی دنیا میں قابل داد وتحسین اب تک کم سخنی، کم گوئی اور بے زبانی تھی۔ مشرقی شوہر "چاند سی دلہن" اس لیے بیاہ کر لاتا تھا کہ وہ اسے اپنے گھر کا چراغ بنادے اور تخیل "خانہ آبادی" کا غالب رہتا، مگر مغربی نظامِ تعلیم کی دین کہ محفل کے طور ہی کچھ اور ہوگئے، نقشہ بالکل ہی بدل گیا، اب تو ٹھاٹھ بزم آرائیوں کے جمے ہوئے، حجاب کی جگہ بے حجابی، سکوت کی جگہ طوفانِ تکلم، مستوری کی جگہ نمائش، عاشق بے چارہ اس کا پلٹ پر دنگ، حیران، گم صم، کل تک جو نقش تصویر تھا، وہ آج گراموفون کی طرح مسلسل وقفِ تکلم:

خامشی سے نہ تعلق ہے، نہ تمکین کا ذوق
اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں "اسپیچ" کا شوق
شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں
بت جو تھے دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

اکبرؔ کے اسی مرقع کا ایک اور منظر

اعزاز بڑھ گیا ہے، آرام گھٹ گیا ہے
خدمت میں ہے وہ لیزی اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر
شوہر پرست بیوی پبلک پسند لیڈی

ایک دوسری جگہ اس مرقع میں آب و رنگ ذرا اور زیادہ بھر دیتے ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے:

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو سنوارا
اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
کچھ جوڑ توان میں کے ہوئے ہال میں رقصاں
باقی جو تھے گھر ان کا تھا افلاس کا مارا
بیرا وہ بنا کمپ میں، یہ بن گئیں آیا
بی بی نہ رہیں جب، تو میاں پن بھی سدھارا
دونوں جو کبھی ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرعہ
" آغاز سے بدتر ہے سر انجام ہمارا "

خواتین کے سماجی کردار کے بارے میں اپنے خاص موقف کے علاوہ، اکبرؔ نے خواتین میں پردے کا رواج برقرار رکھنے کی بھرپور وکالت کی ہے۔ انہوں نے ان لوگوں پر سخت تنقید کی جو خواتین کو بے پردہ کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور پردہ داری کے سبب انہیں دقیانوسی اور جاہل سمجھتے تھے۔ اکبرؔ کے مطابق، پردے کا تحفظ محض روایت کا معاملہ نہیں تھا، بلکہ قومی ترقی کا ایک اہم پہلو تھا۔ ان کا خیال تھا کہ خواتین کا پردہ کرنا معاشرتی اخلاقیات کو برقرار رکھنے اور خاندانی اور ثقافتی اقدار کے تقدس کو برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہے۔ اکبرؔ نے زور دے کر کہا کہ پردہ وقار اور شائستگی کی علامت ہے، جو سماجی نظم اور ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ انہوں نے دلیل دی کہ خود خواتین نے پردہ کر کے بھی ملک کے استحکام اور خوشحالی میں اہم کردار ادا کیا ہے، اور قوم و ملّت کے اخلاقی تانے بانے کی حفاظت کی ہے اور اس کی مسلسل ترقی کو یقینی بنایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں
اکبرؔ زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

☆

پردہ اُٹھ جانے سے اخلاقی ترقی قوم کی
جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ

☆

سن چکا ہوں میں کہ کچھ بوڑھے بھی ہیں اس میں شریک
یہ اگر سچ ہیں تو بے شک پیر نابالغ ہیں وہ
خون میں باقی رہی غیرت تو سمجھے گا کبھی
خوب تھا پردہ نہایت، مصلحت کی بات تھی

اکبرؔ نے اپنی شاعری میں عورتوں کے دو الگ الگ آثار بیان کیے ہیں: مشرقی اور مغربی۔ وہ مشرقی عورت کو باوقار اور احترام کے طور پر پیش کرتے ہیں، اور اس کا موازنہ مغربی عورت سے کرتے ہیں، جسے وہ ماڈرن اور عزت سے عاری سمجھتے ہیں۔ اکبرؔ مشرقی خواتین کی شائستگی اور خوبی کو برقرار رکھنے کی وکالت کرتے ہیں- انہیں پردے میں رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور انہیں دنیا کی عیب دار نظروں سے بچاتے ہیں۔ اس کے برعکس، وہ مغربی خواتین کی بے پردگی اور بے حیائی پر تنقید کرتے ہیں، اور ان کی خوبصورتی سے فائدہ اٹھانے والی نگاہوں کی مذمت کرتے ہیں۔ اکبرؔ کی شاعری مشرقی خواتین کو دی جانے والی تعظیم اور ان کے مغربی ہم منصبوں کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات کے درمیان بالکل فرق کو واضح کرتی ہے۔ مغربی ثقافت اور تہذیب کا مذاق اڑانے کے جوش میں اکبرؔ کا مغربی خواتین کی تصویر کشی ناقابل قبول ہے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ مشرقی یا مغربی سیاق وسباق ہے، ان کے کلام میں خواتین کی تصویر کشی غیر منصفانہ لگتی ہے۔ مغربی اقدار پر تنقید کرتے ہوئے اکبرؔ مغربی خواتین کی خوبصورتی اور وقار کو مجروح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی مثال ان کی نظم "برق کلیسا" میں ملتی ہے، جہاں مغربی خواتین کو توہین آمیز خاکوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس طرح کی خصوصیت غیر منصفانہ دقیانوسی تصورات کو برقرار رکھتی ہے اور تمام خواتین کے موروثی وقار کو مجروح کرتی ہے، چاہے ان کا ثقافتی پس منظر کچھ بھی ہو۔

ممکن نہیں ہے اے مس ترانوٹس نہ لیا جائے
گال ایسے پری زاد ہوں اور کس نہ لیا جائے
تھی میرے پیش نظر وہ بہت تہذیب پسند
کبھی وہسکی مجھے دیتی تھی کبھی شربتِ قند

☆

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں جو دوچار
ہائے وہ حسن، وہ شوخی، وہ نزاکت، وہ ابھار
زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہ گار کریں
گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
تہذیبِ مغربی میں ہے بوسے تلک معاف
اس سے اگر بڑھوں تو شرارت کی بات ہے

اکبرؔ الہ آبادی مغربی خواتین کو غیر دلکش اور اخلاقی طور پر قابل مذمت شخصیت کے طور پر پیش کرنے میں پرعزم نظر آتے ہیں۔ اس نے ایک تصویر پینٹ کی ہے جس میں انگریز خواتین کو دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے دن اور راتیں ہوٹلوں میں تاش کے کھیلوں میں گزارتی ہیں، اور فعال طور پر رومانوی رابطوں کی تلاش میں رہتی ہیں۔ اس کے خیال میں، زندگی میں ان کی بنیادی خواہش عیش و عشرت کا حصول ہے، اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے کسی بھی طرح کے گناہ میں مشغول ہونے کو تیار ہیں۔ اکبرؔ الہ آبادی کی تصویر کشی سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی خواتین میں اخلاقی دیانت کا فقدان ہے، کیونکہ انہیں مادی فائدے کے لیے اپنی اقدار سے آسانی سے سمجھوتہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس طرح کی خصوصیات نہ صرف مغربی خواتین کو غیر منصفانہ طور پر بدنام کرتی ہیں بلکہ ان کے طرز زندگی اور طرز عمل کے بارے میں نقصان دہ دقیانوسی تصورات کو بھی عام کرتی ہیں۔ اکبرؔ الہ آبادی کے اس خیال کی عکاسی کے لیے ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں :

لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز و طریق

ہال میں ناچو، کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش
بادۂ تہذیبِ یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش
جب عمل اس پر کیا، پریوں کا سایہ ہو گیا
جن سے تھی دل کی حرارت کو سراسر انتعاش
سامنے تھی لیڈیانِ زہرہ وش جادو نظر
یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش

اکبرؔ الٰہ آبادی نے اپنے وقت کے ایک ممتاز شاعر کی حیثیت سے بلاشبہ ایسے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، جنہوں نے گہرے شاعرانہ وژن کا مظاہرہ کیا۔ خواتین کو جدید تعلیم فراہم کرنے کی مخالفت کے باوجود، اپنی قوم اور ثقافت سے ان کی گہری محبت واضح ہے۔ انھوں نے اپنے ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے کی پرجوش کوشش کی، گہری حساسیت اور درد سے بوجھل دل سے۔ اگرچہ خواتین کی تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات عصری نظریات کے مطابق نہیں ہو سکتے، لیکن تہذیب اور ثقافت کی حفاظت کا ان کا پیغام ہم سب کے لیے مطابقت رکھتا ہے۔ تاہم، یہ بات قابل غور ہے کہ خواتین کی تعلیم کا منظر نامہ ان کے زمانے سے نمایاں طور پر تیار ہوا ہے۔ آج، لڑکیاں نہ صرف تعلیم میں لڑکوں کے ساتھ چل رہی ہیں بلکہ مختلف شعبوں میں بھی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں، جو کہ اکبرؔ کے دور کے نقطۂ نظر سے ایک اہم رخصتی ہے۔

صدیق الرحمن قدوائی نے اپنی کتاب 'انتخاب اکبرؔ الٰہ آبادی' میں بہت خوب لکھا ہے اور سرسید و حالیؔ کی طرح اکبرؔ کو بھی اصلاح پسند ادیب قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: " اکبرؔ کے نزدیک شاعری کا مقصد زندگی کی تنقید و اصلاح تھا... سرسید تحریک کے علمبرداروں نے اور اکبرؔ نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق شاعری کے ذریعے قومی اصلاح کی کوشش کی۔ سماجی اعتبار سے متضاد نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود سرسید، حالیؔ اور اکبرؔ یکساں ادبی نقطۂ نظر کے حامل تھے"۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اکبرؔ الٰہ آبادی نے انگریزی زبان یا مغرب کی اچھی چیزوں کو اختیار کرنے سے منع نہیں فرمایا، اگر اپنی شاعری میں کہیں 'انگریزی' یا 'انگلش' کی تنقید کی ہے تو ان کا اشارہ انگریزی یا مغربی تہذیب کی طرف ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے جو ثابت کرتا ہے کہ وہ انگریزی زبان کے مخالف نہیں تھے۔

حرف آخر :

اکبرؔ الٰہ آبادی بلاشبہ اپنے عہد کے شعراء میں ایک ممتاز شخصیت کے طور نمایاں نظر آتے ہیں، جن کے کلام میں ایک گہرا شاعرانہ نقطۂ نظر ہے جو طنز و مزاح کے ساتھ ایک گہرا سماجی درس بھی اپنے اندر رکھے ہوئے ہے۔ خواتین کی جدید تعلیمی حصول کی مخالفت کے باوجود، اپنی قوم اور اس کے ثقافتی ورثے کی حفاظت غیر متزلزل طور پر ان کے کلام میں جابجا نظر آتی ہے۔ وہ اپنی ثقافتی وراثت کی حفاظت کے شدید خواہاں تھے، جو ان کی گہری حساسیت اور پُرجوش خود شناسی کا ثبوت ہے۔ اگرچہ خواتین کی تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات متنازعہ ہو سکتے ہیں، لیکن تہذیب اور ثقافت کے تحفظ کا ان کا وسیع پیغام عصری معاشرے کے لیے مطابقت رکھتا ہے۔ تاہم، یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اکبرؔ کے زمانے سے آج تک خواتین کی تعلیم کے منظر نامے میں نمایاں تبدیلی آئی ہے آج، لڑکیاں نہ صرف تعلیم میں لڑکوں کے ساتھ چل رہی ہیں بلکہ مختلف شعبوں میں بھی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ خواتین کی تعلیم کے بارے میں اکبرؔ کے خیالات سے ہمارے اختلاف کے باوجود، ثقافتی تحفظ کے لیے ان کی وکالت ہمیشہ بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے ورثے کی قدر کرنے کی اہمیت کی ایک پُرجوش یاد دہانی اور وکالت کرتی نظر آتی ہے۔

کتابیات:

1. انتخاب اکبرؔ الٰہ آبادی، صدیق الرحمن قدوائی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی: 1973
2. اکبرؔ کی شاعری کا تنقیدی جائزہ، صفر امہدی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی: 1981
3. تانیثی تنقید، شہناز نبی: یونیورسٹی آف کلکتہ :2009
4. نقوش - آپ بیتی نمبر، مدیر محمد طفیل: 1964
5. انتخاب اکبرؔ الٰہ آبادی اور تعلیم نسواں، شہناز نبی: سہ ماہی فکر و تحقیق: 2009

6. کلیات اکبرؔ، اکبرؔ الٰہ آبادی: بزم اکبرؔ کراچی: 1952
7. اکبرؔ الٰہ آبادی تنقیدی و تحقیقی جائزہ، خواجہ محمّد زکریا: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور: 2003
8. پیامی شاعری، نصرت اندرابی: تابش پبلی کیشنز، سری نگر: 1991

By
Dr. Farhana Azmi Mohd.Sadique Sheik
Asst. Professor & Head Dept. of Urdu
Mungasaji Maharaj Mahavidyalaya, Darwha, Dist. Yavatmal

☆☆☆